اصلاحی دور کی نظم کا مختصر اسلوبیاتی جائزہ

ڈاکٹر محمد زاہد خان
Dr. Muhammad Zahid Khan

ABSTRACT:

The obscurantism that was at length practised by the predecessors of Hali as self-evident from their stylistic approach was finally called off by the new emerging stylistic sense of the modernists. Hali was the poetic aura of his times. He, along with his contemporary poets: Azad, Shibli and Meerithi, kicked off with a new undercurrent of meaning, usefulness and reformation, as prior to him it was only envisaged but no endeavour was don on. Hali's epoch was marked with innovations in style of poem which proved beneficial. In a nutshell, the researcher has focused on the style of Hali's epoch with special reference to modern poem.

اصلاحی دور یعنی عہد سرسید کا تعلق ہماری تاریخ کے اس دور سے ہے کہ جہاں زندگی کے ہر شعبہ میں گہری اتھل پتھل کا عمل بڑی سرگرمی سے جاری وساری تھا۔ سیاسی، سماجی، معاشرتی اور ادبی سطح پر منظر بدل رہے تھے کوئی اپنی سیاسی بساط لپیٹ رہا تھا تو کوئی ایک جوش وخروش کے ساتھ ایک نئی بساط بچھا رہا تھا۔ مغلیہ عہد کا خاتمہ ایک طرح سے ایک تہذیبی وحدت کا زوال ثابت ہو رہا تھا اور نئے حکمران نہ صرف اپنے آپ کو سیاسی بنیادوں پر مضبوط کرنے کے لیے تگ ودو کر رہے تھے بلکہ تہذیبی، سماجی، معاشرتی اور ادبی ہر لحاظ سے گذشتہ ہندوستان اور آئندہ کے ہندوستان میں ایک امتیازی خط کھینچنا چاہ رہے تھے۔ اس شعوری کوشش کے نتیجے کے طور پر بہت سست روی کے ساتھ ہی سہی مگر ایک نئی معاشرتی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا اور قبول وناقبول کی بحث سے قطع نظر یہ نئی تہذیب اس خلا کو پر کر رہی تھی جو مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد باقی رہ گیا تھا۔

ہندوستانیوں کے لیے بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص یہ ہمت شکنی اور ذہنی وقلبی پسپائی کا دور تھا۔ گذشتہ کا غم اپنی جگہ تو تھا ہی مگر آئندہ کا لائحۂ عمل بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر اس گومگو کی کیفیت

☆ لیکچرار، گورنمنٹ بوائز انٹر کالج، خورشید آباد، حویلی، آزاد کشمیر

میں سرسید کی مفاہمانہ ادبی وسیاسی پالیسی نے ایک راستہ دکھایا جو ٹکراؤ کی جگہ تسلیم کی منزل تک لے گیا، سرسید بخوبی سمجھتے تھے کہ اگر اس قوم نے اس دنیا میں باقی رہنا ہے تو اس کو اپنے بنیادی نقطۂ نظر میں تبدیلی لانا پڑے گی جو محض جذبات کی بنیاد پر استوار ہے اور روایت پرستی اور قدامت پسندی جس کے بنیادی اجزا ہیں، معروضی حالات اس بات کی غماضی کرتے تھے کہ مسلمانوں کو اپنے رویوں میں ایک انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہے اور سرسید کے خیال میں اس انقلاب کے لیے سب سے پہلے افہام وتفہیم کی ضرورت تھی۔(۱)

نئے حکمرانوں کے ساتھ مفاہمت اور نئے سیاسی و تعلیمی نظام سے استفادہ کرنے کی جو خواہش سرسید کے دل میں موجود تھی، اس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کی تو ہندوستانی مزاج اور سماج میں مغربی طرز فکر کی گنجائش خود بخود بنتی گئی اور اس کے اثرات دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح ہندوستانی ادب پر بھی پڑے۔ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

> ''تہذیب الاخلاق'' کے اجرا سے جہاں ایک طرف اردو کے مجموعی ادبی منظر نامے میں تبدیلی کے امکانات پیدا ہوئے تو دوسری طرف بالخصوص اردو نثر کے لب و لہجے اور موضوعات میں ایک واضح تبدیلی نظر آنے لگی۔ اردو ادب مخصوص روایتی حصار سے نکل کر نئے موضوعات، ہئیتوں اور اسالیب کی تلاش میں سرگرداں ہوا اور یہ زبان اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور، اثر وسعت و جامعیت، سادگی وصفائی سے بیان کر سکی۔''(۲)

اُردو ادب کے سبھی شعبوں پر اس ''وسعت و جامعیت، سادگی وصفائی'' کی مہم کے اثرات پڑے تاہم اردو نظم تبدیلی کے ان مراحل میں باقی اصناف کے مقابلے میں کچھ آگے رہی۔ الطاف حسین حالی، آزاد اور شبلی نے اردو شاعری کی تخلیقات میں نئے الفاظ وفکر سمونے کی شعوری کوشش کی اور نظم کو جدت آفرینی، فطرت نگاری اور مقصد پسندی کی راہ پر لگانے کے لیے اپنے اپنے انداز اور مزاج کے مطابق کاوشیں کیں۔ اس طرح نظم میں نیچرل شاعری کے حوالے سے ایک نئی دنیا آباد ہوئی اور موضوعاتی، ہئیتی، اور اسلوبیاتی سطح پر تبدیلی کا ایک واضح احساس پیدا ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔

اس نیچرل اور اصلاحی شاعری میں حالی کی حیثیت امام کی سی ہے۔ حالی کی کوششوں سے بے جا محاورہ بندیوں، لفظی صناعیوں اور رنگینیوں کی جگہ سادگی، روانی اور افادیت شعری اسلوب کے اجزا شمار ہوئے جس کی تعریف کرتے ہوئے حالی مقدمہ شعروشاعری میں لکھتے ہیں:۔

> ''نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معنیً دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو، لفظاً نیچرل کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترتیب و بندش تا بمقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو جس میں شعر کہا گیا ہے اس ملک کے حق میں جہاں وہ زبان بولی جا چکی ہے نیچر یا سیکنڈ نیچر کا حکم رکھتے ہیں۔

پس شعر کا بیان جس قدر کہ بے ضرورت معمولی بول چال اور روزمرہ سے بعید ہوگا اسی قدر ان نیچرل سمجھا جائے گا۔ معنی نیچر کے موافق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہئیں۔ پس جس شعر کا مضمون اس کے خلاف ہوگا وہ ان نیچرل سمجھا جائے گا۔''(۳)

اس نسبتاً طویل اقتباس کہ جس میں حالی نے نیچرل شاعری کی تعریف بیان کی ہے کا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو ہمیں نیچرل شاعری کی اس تعریف کے بطن سے حالی کا اسلوب شعری برآمد ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

۱۔ شعر کے الفاظ اور ان کی تراکیب و بندش کا زبان کے معمول اور روزمرہ بول چال کے موافق ہونے سے مراد زبان کے استعمال میں سادگی، روانی اور بے تکلفی کے عناصر کو اولیت دینے کے مترادف ہے۔ گو یا اس نکتے سے ''سادگی'' اور ''بے تکلفی'' کے عناصر وجود پذیر ہو رہے ہیں۔

۲۔ شعر میں ایسی باتیں بیان کرنا جو ہمیشہ سے دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہئیں، اس بات سے فطرت پسندی اور منطقیت کا وجود جنم لیتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک جگہ حالی کے اسلوب کا سرسید کے اسلوب بیان سے موازنہ کرتے ہوئے حالی کے اسلوب کی جو صفات بیان کی ہیں وہ بھی تقریباً یہی ہیں جو سطور بالا میں بیان کی گئی ہیں کہ سید صاحب کے اسلوب کی تین خصوصیات حالی کے اسلوب میں ملتی ہیں، سادگی، منطقیت اور بے تکلف اظہار۔(۴)

حالی کہ جن کی شعری تربیت میں غالب و شیفتہ جیسے کلاسیکل شعرا کا بھی ہاتھ رہا ہو اور ان کی روایتی غزل کا آہنگ غالب سے ملتا جلتا بھی ہو، کے لیے آسان نہ تھا کہ وہ ایک ایسی شعری فضا کے قائم کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتے کہ جس کے ظاہر و باطن اور زباں و بیاں کی خصوصیات میں مرصع ساز لفظیات ، ایمائیت و رمزیت اور پر تخیل موضوعات کی بجائے ، مقصدیت کے تابع ہو کر سادگی ، فطرت پسندی اور منطقیت اہم ترین اجزا کی صورت اختیار کرتے ہوئے نظر آئیں۔ مگر چونکہ سرسید کی رفاقت اور انجمن پنجاب کی ملازمت نے انھیں اس راستے پر گامزن کر دیا تھا لہٰذا انھوں نے اپنی شاعری بالخصوص نظم نگاری میں اس رنگ کو ایسا چمکایا کہ شاعری محض شاعری نہ رہی بلکہ عوام سے مخاطب ہونے کا ایک نہایت اہم واسطہ بن گئی۔ اصل میں انگریزوں کے آنے کے بعد جو ایک نئی تہذیب آئی تو اس کو سمجھنے اور بیان کرنے کے لیے زبان میں تغیر کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ حالی نے اس ضرورت کو تقریباً سب سے پہلے سمجھنے کی کوشش کی اور اپنے شعور کی تازگی سے مرصع ساز لفظیات کے طلسم سے دور ایک جو نئی زبان مہیا کی جا سکتی تھی وہ اردو نظم کو عطا کی اور نظم کی شاعری میں وہ کام کیا جو کوئی دوسرا شاید نہیں کر سکا۔ ان کے اس خطابیہ اسلوب اور سادگی کی حامل ایک نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد
نوعِ انساں کا جس کو سمجھیں فرد
جس پہ اطلاقِ آدمی ہو صحیح
جس کو حیواں پہ دے سکیں ترجیح
قوم سے جاں تک عزیز نہ ہو
قوم سے بڑھ کر کوئی چیز نہ ہو
رنج کو ان کے سمجھے مایۂ غم
واں اگر سوگ ہو تو یاں ماتم
بھول جائے سب اپنی قدرِ جلیل
دیکھ کر بھائیوں کو خوار وذلیل
بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو!
اُٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو
مرد ہو تو کسی کے کا م آؤ
ورنہ کھاؤ ، پیو ، چلے جاؤ (۵)

شاعری جب عوام سے مخاطب ہونے کا وسیلہ بنی تو اس کے لب و لہجے میں بھی ایک عوامی تبدیلی آئی۔ دور از کار علامتوں اور تلازمات کی جگہ عام بول چال کی زبان شعر کا اُسلوب بن گئی اس طرح حالی کی معرفت اردو نظم ایک بیانیہ اور فطری اسلوب سے آشنا ہوئی، ڈاکٹر ساجد احمد حالی کے اس بیانیہ اسلوب کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:۔

> ''حالیؔ کی تربیت میں غالبؔ، شیفتہ، سرسید اور انجمن پنجاب کی ملازمت کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان صحبتوں کا مرکب اس شکل میں ظاہر ہوا کہ تخیل کی رفعت میں اعتدال پیدا ہوا۔ سادگی، روانی، اور افادیت ان کا مقصد بن گئی۔ تشبیہ واستعارہ کا خوف دامن گیر ہوا اور زبان فارسی اثرات سے آزاد ہو گئی۔ انہی صفات سے ان کا اسلوب ترتیب پا تا ہے انھوں نے براہِ راست خطاب کو ترجیح دی، تفصیل و جزئیات کو خاص اہمیت دی، حقائق ومشاہدات کو پیش نظر رکھا، وعظ ونصیحت کا جوش مقصود ٹھہرا۔ الفاظ کی نشست و برخاست عوام کی ذہنی سطح کے قریب رکھی ۔۔۔ حالی صرف سادگی ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔''(۶)

حالی دراصل طبعاً نہایت منکسر المزاج شخص تھے لہٰذا ان کی شاعری اور نثر کے اسلوب پر ان کے انکسار اور دردمندی کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے۔(۷) طبیعت کے اسی انکسار اور دل کی درمندی کی مدد ہی

سے حالی مقصدیت سے بھرے سپاٹ مضامین کی خشکی کو سچے جذبات کا ترجمان بنا دیتے ہیں۔ اس طرح اجتماعی مسائل وحقائق کا منطقی بیان سادگی کے دریا کی موج رواں بن جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ حالی کے شعری اسلوب بالخصوص ان کی نظم کے بیانیہ اور فطری اسلوب کی بنیادیں ''سادگی'' کے اصول پر قائم ہیں۔

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو(۸)

اور اس سادگی نے ان کے اسلوب کو بعید از فہم تراکیب، نامانوس الفاظ اور غیر ضروری اطناب سے پاک رکھا۔(۹) مسدس حالی کا ایک مشہور بند ملاحظہ ہو کہ جس میں اصلاحی تحریک کے مسلک کی جھلک اور حالی کا واعظانہ اسلوب بیاں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

زمانے کا دن رات ہے یہ اشارہ
کہ ہے آشتی میں مری یاں گزارہ
نہیں پیروی جن کو میری گوارہ
مجھے ان سے کرنا پڑے گا کنارہ
سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی(۱۰)

نیچرل شاعری کی اس تحریک میں حالی کے ہمنوا وہم قدم محمد حسین آزاد بھی تھے۔ اگرچہ آزاد ایک شاعر سے زیادہ ایک صاحبِ طرز انشا پرداز تھے مگر جدید شاعری بالخصوص نئی نظم کی تحریک میں ان کا کردار کلیدی ہے۔ اس بنیادی کردار میں ایک تو ان کے وہ لیکچرز ہیں جو انھوں نے انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے اردو شاعری کے روایتی مضامین و اسالیب کے حوالے سے دیے اور جن میں انھوں نے ''خیال بندی'' اور ''نازک خیالی'' کے محدود دائروں پر فخر کرنے کی بجائے ''واقعی سرگزشت''، علمی مطلب، اور ''اخلاقی مضمون'' کو نظم کرنے کی ترغیب دی تھی۔ اور دوسرا اسی انجمن پنجاب کے نظمیہ مشاعروں (۱۸۷۴ء) میں انھوں نے ایسے موضوعات پر نظمیں بھی لکھیں جو خیال بندی اور نازک خیالی کے دائروں کو فی الواقع توڑ کر نئے عنوانات و نئے اسالیب کے لیے پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔

انجمن پنجاب کے ان نظمیہ مشاعروں میں آزاد نے تقریباً ہر ایک مشاعرے میں نظم پڑھی ان مشاعروں میں حالی اور آزاد نے جن موضوعات پر زیادہ نظمیں پڑھیں ان میں بیشتر کا تعلق نیچرل شاعری سے ہے۔ حالی کے ہاں اخلاقی مضامین بھی موجود ہیں مگر آزاد چونکہ طبعاً مقصدیت سے زیادہ فطرت پسند اور لطیف گو تھے لہٰذا ان کے موضوعات معروضی مقاصد کے ساتھ ساتھ خالصتاً ادبی مقاصد کے تحت بھی تھے۔ حالی نے مقصدیت کے جوش میں جو بلند آہنگی اور واعظانہ خطابت کی طرح ڈالی تھی اس سے شاعری میں تخیل کا داخلہ قریب قریب ممنوع ہو گیا تھا۔ اس طرح ایک سپاٹ اور کسی حد تک خشک اسلوب

حالی کی پہچان بن گیا تھا۔ آزاد بھی حالی کی طرح سرسید کی پیروی میں مغرب کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے لیکن وہ اس اتباع میں دوطرح کے امتیاز کے حامل بھی تھے۔ پہلی بات یہ کہ محض مقصدیت کی جگہ آزاد مغربی روایت کو خالصتاً ادبی مقاصد کے ساتھ مروج کرنا چاہتے تھے اور دوسری بات یہ کہ وہ مقصدیت کی اس تحریک میں حالی کے قریب ہونے کے باوجود ایک فاصلے پر کھڑے تھے کہ انھوں نے اپنی نظموں میں جو زبان استعمال کی ہے وہ حالی کی زبان سے یکسر مختلف ہے۔ آزاد اگرچہ اپنی تقریروں، وعظوں اور لیکچرز میں روایتی شاعری میں برتی جانے والی فارسی زبان اور اس کے روایت اسالیب پر نکتہ چینی کرتے ہیں مگر اپنی شاعری میں فی الواقع وہ اس کا کامل ترین عملی اظہار نہیں کر سکے ہیں۔ لہٰذا ان کا اسلوب خیال کی دنیا اور حقیقتوں کی دنیا کے باہم اتصال سے وجود میں آتا ہے۔ اس طرح ان کی شاعری جدید رویوں کی ترجمان ہونے کے ساتھ رنگینی و تصویر کاری کی صورت گر بھی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد لکھتے ہیں:۔

> ''حالی نے شاعری کو نیچر کا پابند بنا کر تخیل کے راستے بند کر دیے تھے ان کے تمام کلام میں تخیل دبا دبا نظر آتا ہے اسی لیے ان کا اسلوب خشک ہو گیا البتہ آزاد کا اسلوب تخیل و حقائق کی آمیزش سے رنگینی و تصویر کاری کی صورتیں پیدا کرتا ہے وہ اپنے خیالات میں فارسی کے مخالف ہیں لیکن شاعری کے نمونوں میں وہ بات پیدا نہیں کر سکے وہ مقصد میں حالی سے قریب ہیں لیکن زبان یکسر مختلف ہے۔
>
> آرمستاں کہ ہے تو بادشا برفانی
> شاہ برفانی و شاہنشہ برفستانی
> باد صر صر ہے نشاں تیرا اڑاتی آتی
> فوج اقبال کو رستہ ہے بتاتی آتی
>
> اس مختصر سے اقتباس میں ان کی مخصوص تراکیب۔۔۔ ان کے اسلوب کو حالی کے اسلوب سے الگ کرتی ہیں آزاد پر شکوہ اور ادیبانہ انداز کے قائل تھے۔ لطافت ان کے اسلوب کا جوہر ہے۔''(۱۱)

آزاد کے اسلوب میں ان کی شخصیت کی کرشمہ سازی بھی شامل ہے مگر فی الحقیقت ان کے اس رنگین مگر بیانیہ اسلوب کی تہ میں ان کی وہ شعوری کوشش بھی موجود ہے جس کے تحت انھوں نے شاعری کو کسی واعظ کی وعظ اور مصلح کی پند و نصائح نہیں بننے دیا۔ حقیقی شاعری کی بنیادوں کو مسمار کیے بغیر انھوں نے اپنی شاعری کو اصلاحی تحریک سے وابستہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب کی شادابی قائم بھی رہتی ہے اور وہ حالی کے خطیبانہ اور بیانیہ اسلوب کے واضح شراکت دار بھی بن جاتے ہیں۔ ان کی نظم ''حُبِ وطن'' کے مندرجہ ذیل اشعار ان کے اس الگ طرزِ بیان کی وکالت کرتے نظر آتے ہیں:۔

حب الوطن ہے نور میں ، ہم نور آفتاب

اور کرتا ہے ظہور بدستور آفتاب
اُس کا بھی روز وشب کی طرح ہیر پھیر ہے
اِک جا جو روشنی ہے تو اِک جا اندھیر ہے
آج اس کا آفتاب ہے اوج فرنگ پر
اور رات ہند کی ہے رُخِ تیرہ رنگ پر
ہے کچھ حساب اور وہاں کی کتاب کا
رکھتا ورق ورق ہے نشاں آفتاب کا
جاں باز ہیں تو ہر وطن جاں نثار ہیں
اور تیغ عزم رکھتے سدا آبدار ہیں(۱۲)

اصلاحی دور کی نظم نگاری میں حالی اور آزاد کے ساتھ ایک تیسرا نام شبلی نعمانی کا بھی ہے شبلی ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ آئے۔ طبعاً وہ بہت جلد زیر اثر آنے والے شخص نہ تھے مگر علی گڑھ تحریک کے بعض اثرات اُنھوں نے بہت جلد قبول کر لیے۔ ان میں ملت کی بربادی کا درد اور احساس سر فہرست ہے اور یہی احساس انھیں اس تحریک کے قریب لایا اور سرسید کے رفقا کی فہرست کا حصہ بنے۔ شبلی حالی و آزاد کی طرح پر گو شاعر نہیں تھے تاہم کبھی دل کے ہاتھوں تو کبھی دنیا کے ہاتھوں مجبور ہوئے تو ان کی وقتی پناہ گاہ نگار خانۂ شعر ہی بنی۔ شبلی سرسید تحریک کی مقصدیت پسندی اور منطقیت و استدلالیت بھری فضا کا حصہ تو تھے مگر ان کے انداز بیان پر اس واعظانہ خطابت کا اثر بہت کم پڑا ہے جو حالی کا شعری خاصہ بن گئی تھی۔ شبلی جمالیاتی نقطۂ نظر سے انس رکھنے والے شاعر تھے۔ اگرچہ ملت کے درد کے احساس سے مملو ان کی بعض نظمیں علی گڑھ تحریک کے مقصدی ادب کا حصہ بنیں جن میں ''صبح امید'' اور ''تماشائے عبرت'' اہمیت کی حامل ہیں مگر ان نظموں کے پیرایہ بیان میں ان کے جمالیاتی نقطۂ نظر کے زیر اثر لفظ جب کاغذ کی سطح پر بکھرتے ہیں تو لگتا ہے کہ ان لفظوں نے رنگ کی صورت اختیار کر لی ہو اور کینوس پر تصویریں سی بن رہی ہوں۔ دراصل شبلی کے ہاں شاعرانہ مصوری ہی فن شعر میں ان کے لیے باعث لطف و حظ تھی مشاہدہء فطرت اور تخیل شبلی کی شاعری بالخصوص نظم کی بنیادوں میں موجود تھے۔ وہ شاعری کسی اثر کے تابع رہ کر کرنے کے عادی نہیں تھے ان کے نزدیک شاعر کی کامل آزادی شعر کہنے کے لیے بہت ضروری تھی۔ ان کی نظم ''صبح امید سے چند اشعار درج ذیل ہیں:

گو غیر اب اہلِ انجمن ہیں
ہم گرمِ فسانہ، کہن ہیں
ہر چند وہ بزم ہے، نہ احباب
ہم دیکھ رہے ہیں پر وہی خواب

اس گونج گھر پہ ہم ہیں ناداں
جس کا کوئی جوہر نہیں یاں
از بسکہ ذلیل وخوار ہیں ہم
افسانہ روزگار ہیں ہم
ہے اوج پہ بختِ بد ہمارا
دیکھے کوئی جذر و مد ہمارا(۱۳)

شبلی کی نظموں کا اسلوب بھی بیانیہ ہے مگر ان کے داخلیت پسند شعری وجدان، فارسی سے غیر معمولی شغف اور مشرق پسندی کی وجہ سے اس میں سادگی کے بجائے رنگینی و پرکاری ہے۔ حالی جب امت مرحوم کا درد بیان کرنے لگتے ہیں تو لگتا ہے مرثیہ خوانی کر رہے ہوں کیونکہ ان کے ہاں دردمندی میں جو انکساری شامل ہے اس کے باعث ان کی نظموں کی ظاہری سطح پر یاسیت کی ایک تہ چڑھی ہوئی نظر آتی ہے۔ مگر شبلی کے ہاں اس کے برعکس ہے شبلی کی مثنوی ''صبح امید'' جو فکر اور موضوع کے اعتبار سے حالی کی ''مسدس'' کے قریب تر ہے کی ظاہری سطح پر رجائیت کی شان واضح طور پر نظر آتی ہے اس طرح حالی کے مقابلے میں شبلی کا اسلوب رجائی ہے شبلی کا بیان و اسلوب جوش، اثر، روانی، رجائیت، شگفتگی اور لطافت سے ترتیب پاتا ہے۔(۱۴)

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کا نام سرسید کی اصلاحی تحریک کے نظم نگاروں میں ہوتا ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی براہِ راست سرسید کے حلقہ یا رفقا میں شمار نہیں ہوتے تھے مگر سرسید کے اصلاحی مقاصد کی دل وجان سے قدر کرتے تھے وہ جدید مغربی علمی و ادبی رویوں سے بھی شناسا تھے اور انجمن پنجاب کی جدید شاعری کی تحریک کے اثرات بھی انھوں نے اپنی شاعری میں قبول کیے تھے۔ میرٹھی کا شاعری کے میدان میں اہم کام بچوں کے لیے نظم نگاری تھا پیشے کے اعتبار سے میرٹھی ایک مدرس تھے لہٰذا بچوں کی تربیت کے حوالے سے جن لوازمات ادب کی ضرورت ہوتی ہے وہ انھوں نے بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر اپنی نظموں کی صورت میں پیش کر دیے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔ان کا اصل میدان نظم نگاری ہے ان کی نظموں کا بیشتر سرمایہ بچوں کے درس وتدریس کے لیے ہے۔ ان میں اخلاقی پندونصائح کو بڑے دل کش انداز اور سادہ وسلیس زبان میں مؤثر طریق سے نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے اور بچوں کی نفسیات کو سمجھنے اور ان کی ذہنی تعلیم وتربیت میں ایک حقیقی مدرس اور ماہر علم النفس کی فہم وبصیرت کا پورا پورا ثبوت دیا گیا ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی کی نظموں کا عام انداز خارجی مظاہر کی تصویر کشی ہے انھوں نے ہندوستانی دیہات اور دیہی زندگی کی کامیاب عکاسی کی ہے اس اعتبار سے ان کا شمار بھی جدید شاعری کے بانیوں میں ہوتا ہے۔''(۱۵)

اصلاحی تحریک کے ان چار نمایاں شاعروں میں اسلوب کے حوالے سے جہاں شبلی کا میلان آزاد کی طرف نظر آتا ہے تو وہیں اسمٰعیل میرٹھی حالی سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ سیدھے سادے اور موثر الفاظ میں ان کی نظم نگاری حالی کی سادگی، نرمی اور حقیقت پسندی کی ہمنوا نظر آتی ہے۔ میرٹھی کی نظم کا غالب حصہ بچوں کے لیے تھا لہٰذا وہ اس بات سے باخبر تھے کہ سیدھی سادھی شاعرانہ زبان ہی بچوں کے لیے ابلاغ و تسکین کا باعث ہو سکتی ہے اسی رویے کی وجہ سے ان کی نظموں کا لب و لہجہ معلّمانہ اور مدرسانہ بھی نظر آتا ہے گویا اسمٰعیل میرٹھی کے اسلوبِ نظم کو اس تناظر میں مدرسانہ اسلوب بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی مدرسانہ لہجے کے چند اشعار درج ذیل ہیں جن میں اعلیٰ اخلاقی مضامین بہت سادگی، روانی اور مؤثر الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں:۔

جب تک سبق ملاپ کا یاد رہا
بستی میں ہر ایک شخص دل شاد رہا
جب رشک و حسد نے پھوٹ ان میں ڈالی
دونوں میں سے ایک بھی نہ آباد رہا

پانی میں ہے آگ لگانا دشوار
بہتے دریا کو پھیر لانا دشوار
دشوار سہی مگر نہ اتنا جتنا
بگڑی ہوئی قوم کو بنانا دشوار(۱۶)

الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی اور مولانا اسمٰعیل میرٹھی سرسید کی اصلاحی تحریک سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق رکھنے والے نمایاں شاعر ہیں ان کے ہاں انفرادی سطح پر اسلوب کے الگ الگ دائرے بھی موجود تھے اور اس دور کا ایک مجموعی اسلوب بھی موجود تھا۔ ڈاکٹر رشید امجد ان شعرا کے اسلوب کی انفرادی خصوصیات اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

''مقصدیت کے جوش نے حالی کے یہاں بلند آہنگی اور واعظانہ خطابت پیدا کی، اس کے برعکس شبلی جمالیاتی نقطۂ نظر کے حامی تھے۔ شاعرانہ مصوری ان کے لیے انبساط کا ذریعہ تھی وہ تخیل کو بنیادی شرط قرار دیتے تھے اور فطرت کے مشاہدے کو اہم سمجھتے تھے۔۔۔ حالی بھی تخیل کے مخالف نہ تھے اور نہ ہی مشاہدہ کائنات سے انکار کرتے تھے لیکن وہ تخیل کی اس صورت کو پسند نہیں کرتے تھے جہاں قوتِ متخیلہ بے محابا و بے راہ ہو جاتی تھی۔۔۔ دوسری طرف حالی اور آزاد ہم آہنگ ہونے کے باوجود شعر گوئی اور نظم کی تحریک میں ایک دوسرے سے الگ سوچ رکھتے تھے۔۔۔ حالی نے اخلاقی مضامین کو اہمیت دی اور آزاد نے نیچرل شاعری کو مقبول بنانے پر زور دیا۔''(۱۷)

نقل کردہ اقتباس کی روشنی میں دیکھا جائے تو انفرادی طور پر ان تینوں حضرات کی نظم نگاری میں کسی حد تک ان کا اپنا ایک الگ اسلوب موجود تھا۔ تاہم ان الگ الگ اسالیب پر اصلاحی مقصد کی پیش کاری کے لیے مناسب ترین بیانیہ، واعظانہ اور خطیبانہ اسلوب کا رنگ حاوی تھا اور یہی اس اصلاحی دور کی نظم کا مجموعی اسلوب بھی کہلا سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، آج کا اردو ادب، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۷۰ء، ص، ۲۲

۲۔ شبلی نعمانی، سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر، مشمولہ: نگار، سرسید نمبر حصہ اول، ۱۹۷۱ء، ص، ۱۱

۳۔ حالی، الطاف حسین، مقدمہ شعر و شاعری، لاہور: خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۱ء، ص، ۸۶

۴۔ عبداللہ، سیّد، ڈاکٹر، سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص، ۸۷

۵۔ الطاف حسین حالیؔ، کلیاتِ نظم حالی، مرتبہ: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، لاہور: مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۶۸، ص ۳۹۹

۶۔ ساجد احمد، ڈاکٹر، اُردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۳۸۹

۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور: عزیز بک ڈپو، طبع پنجم، ۲۰۰۶ء، ص ۲۸۳

۸۔ الطاف حسین حالی، بحوالہ: ساجد امجد، ڈاکٹر، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، ص ۳۸۹

۹۔ ساجد امجد، ڈاکٹر، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، ص ۳۸۹

۱۰۔ الطاف حسین حالی، جواہر حالی، مرتبہ: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، لاہور: کاروانِ ادب، ص ۲۸۰

۱۱۔ ساجد احمد، ڈاکٹر، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، ص ۳۹۰

۱۲۔ محمد حسین آزاد، حب وطن (نظم)، بحوالہ: عارف ثاقب، انجمن پنجاب کے مشاعرے، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۲۹۲، ۲۹۳

۱۳۔ شبلی نعمانی، کلیاتِ شبلی (اردو)، لاہور: داتا پبلشرز، س۔ن، ص ۶

۱۴۔ ساجد امجد، ڈاکٹر، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات،، ص ۳۹۰

۱۵۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اُردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۳۷۰

۱۶۔ اسمٰعیل میرٹھی، بحوالہ: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص: ۳۷۱

۱۷۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب رویے اور رجحانات، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۰ء، ص، ۲۴